ڈاکٹر محمد آصف

استاد شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

متوازن جدیدیت کا تمثال آفریں غزل گو۔شکیب جلالی

Dr. Muhammad Asif

Department of Urdu, BZU, Multan

Shakaib Jalali:A Poet of Modern Imagery and Symbolism

Shakaib Jalali is one of the Ghazal writer who died in the flower of youth. He made his mark in a unique way in the presence of such great poets as Nasir Kazmi, Faiz Ahmad Faiz and Shezad Ahmad. He imparted modernism and balance to Urdu Ghazal. Imagery and symbolism are the essence of his Ghazal. He has not been focused upon in the prospective of modernism in spite of the fact that he is Ghazal writer with imageries of balanced modernism. His studying reveals that he is the first regular representative poet and father of modern Ghazal after the emergence of Pakistan. The following article highlights these facts.

بیسویں صدی کے نصف اول اور پھر تقسیمِ ہند کے بعد کچھ عرصے تک تمام تر مخالفتوں اور گردن زدنی قرار دیے جانے کے باوجود غزل اپنے نئے موضوعات و اسالیب کے ساتھ نہ صرف زندہ رہی بلکہ ہنوز پائندہ و تابندہ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مخصوص سیاسی و سماجی اور ادبی فضا نے غزل کی بجائے نظم کو اولیت دینے کا رجحان پیدا کیا۔ رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ اور غیر وابستہ بہت سے شعراء (مثلاً اقبال، جوش، حفیظ جالندھری، روش صدیقی، اختر شیرانی، عظمت اللہ خاں، احسان دانش، تصدق حسین خالد، ن۔م۔راشد، میراجی، وزیر آغا، فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی اور مجید امجد وغیرہ) نے فکری و فنی اعتبار سے ایسی مضبوط نظمیں پیش کیں کہ نظموں کے آئینہ خانے میں غزل اپنے تشخص سے محروم ہونے لگی اور اس کی طرف سے مایوسی اور بے اطمینانی کا اظہار کیا جانے لگا۔ نظم کی اس بے پناہ مقبولیت کے دور میں بھی جن کے دم قدم سے غزل نے اپنے نازک وجود کو پوری حشر سامانیوں کے ساتھ زندہ رکھا۔ ان میں اقبالؔ، حسرتؔ، یگانہؔ، فانیؔ، اصغرؔ،

جگر، احسان دانش، فراق، فیض، احمد ندیم قاسمی، مجروح سلطان پوری اور پھر ناصر کاظمی، شہرت بخاری، شہزاد احمد، ظفر اقبال، احمد فراز، منیر نیازی، وزیر آغا، شکیب جلالی، تنویر سپرا اور اقبال ساجد وغیرہ ایسے شعراء تھے جنہوں نے اپنی متغزلانہ تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت جدید نظم کے تند و تیز سیلاب میں بھی عروسِ غزل کے حسین وجود پر خراش تک نہ آنے دی بلکہ اسے اور زیادہ حسن و جمال اور طاقت و توانائی سے نوازا۔ بالخصوص تشکیل پاکستان کے بعد (بلکہ فوراً بعد) ناصر کاظمی، فیض، فراز، شہزاد احمد، ظفر اقبال، مصطفیٰ زیدی، سیف زلفی، قتیل شفائی، شہرت بخاری، شکیب جلالی وغیرہ نے غزل کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس وقت خصوصاً فیض، ناصر کاظمی، احمد فراز اور شہزاد احمد غزل کے افق پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی میں غزل میں اپنا مقام بنانا بلکہ سربرآوردہ رکن بننا آسان کام نہ تھا لیکن شکیب جلالی چند ہی برسوں میں، کم عمری ہی میں حیرت انگیز طور پر اپنی بے پناہ تخلیقی اور فنی قوتوں کی بدولت نہ صرف ان غزل گو شعراء کے برابر آ کھڑا ہوا بلکہ غزل کا بے حد منفرد اور سرکردہ رہنما شمار کیا جانے لگا اور حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان میں شکیب جلالی کے دم سے اردو غزل نے ایک نیا رنگ روپ اختیار کیا، ایک نیا سنبھالا لیا، ''اگر اس دور میں شکیب جلالی سے شاعر پیدا نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ اردو غزل ایک دم دو سو سال پیچھے چلی جاتی اور آئندہ نسل میں اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہتا شکیب کی غزل نے اردو شعر و ادب کے قاری کو بتایا کہ غزل گو بیسویں صدی کے نصف آخر کا ایک باشعور فرد ہو کر بھی غزل کہہ سکتا ہے اور ایسی غزل کہہ سکتا ہے جس میں عصرِ رواں کی روح بول رہی ہو اور جو اس کے باوجود غزل ہو''۔ (۱)

شکیب جلالی نے نظم کے سیلاب میں بہنے کے بجائے غزل کے ان مخصوص مضوعات اور اسالیب کو بدلا جن کی وجہ سے غزل کو فرسودہ اور پامال کہا جا رہا تھا اس نے نئی نظم کی بجائے نئی غزل کی بات کی اور غزل کو زندگی سے قریب تر کر کے ایسے موضوعات اور اسالیب شعری متعارف کروائے جو اس صنف کے لیے بالکل نئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے روایت سے یکسر ناطہ بھی نہیں توڑا۔ پاکستان میں ۱۹۵۸ء کے آس پاس غزل میں جدیدیت اور تمثال آفرینی کے رجحان کو فروغ دینے، مقبول بنانے اور اس کو متوازن بنانے والوں میں شکیب جلالی کا نام مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ شکیب جلالی کے دور میں فیض اور ناصر کاظمی جیسے شعراء بے حد رچی ہوئی غزلیں تخلیق کر رہے تھے'' مگر وہ شکیب ہی تھا جس نے غزل کو موضوع و اظہار کے حوالے سے ایک متوازن جدت کا موڑ دیا۔ (۲)

یوں تو مختلف ناقدین اور تخلیق کاروں نے شکیب کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور اسے مختلف القاب سے نوازا ہے مثلاً ''جدید غزل نگاروں کا قافلہ سالار''(۳) ''اردو غزل کی امید گاہ''(۴) ''علامتی شاعری کا بانی''(۵) ''نئی غزل کا ناخدا''(۶) ''جدید غزل کا پیش رو''(۷) ''نئی نسل کا سب سے بڑا شاعر''(۸) ''غزل کو نئی کروٹ دینے والا''(۹) تاہم شکیب جلالی پر تحقیق و تنقیدی حوالوں سے کام بے حد کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے اور نامور محققین و ناقدین نے شکیب جلالی پر بہت کم توجہ دی ہے سو ہمارے آرٹیکل کا ایک جواز یہ بھی ہے اور علاوہ ازیں یہ جائزہ لینا بھی کہ مندرجہ بالا تعریفی و توصیفی آراء کو پرکھا جائے، مزید براں

ان آراء سے قبل ہم نے مندرجہ بالا سطور میں جو مفروضہ شکیب کے بارے میں قائم کیا ہے، اس کی چھان بین کی جائے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ شکیب کی شخصیت اور عصر کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی متغزلانہ روح تک پہنچا جائے تا کہ حقائق و نتائج سامنے آسکیں۔ بالخصوص جدیدیت کے تناظر میں شکیب کی غزل کا تجزیہ ضروری ہے۔ اس حیثیت سے شکیب کی غزل کو عموماً نہیں دیکھا گیا۔

شکیب جلالی کا نام سید حسن رضوی اور تخلص شکیب تھا۔ ۱۹۳۴ء میں علی گڑھ کے قصبہ جلالی میں پیدا ہوا(۹) اسی نسبت سے شکیب جلالی اختیار کیا۔ شاعری کا آغاز ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ شادی ۱۹۵۶ء میں اپنی خالہ زاد سیدہ محدثہ خاتون سے ہوئی۔ دو بچے ہوئے۔ بیٹے کا نام حسین اقدس رضوی اور بیٹی کا نام حنا بتول رکھا۔ چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ والد اور تایا ذہنی طور پر عدم توازن کا شکار تھے جس کے نتیجے میں شکیب کے والد نے ان کی آنکھوں کے سامنے عالمِ دیوانگی میں اپنی اہلیہ سے محبت کے باوجود، چلتی گاڑی کے آگے دھکا دے دیا۔ محض دس برس کی عمر میں شکیب اپنی شفیق والدہ کے سائے سے محروم ہوا اور یہ حادثہ ساری زندگی کے لیے اس کے لاشعور میں نقش ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء میں بدایوں سے میٹرک کر کے بہنوں کے ہمراہ پاکستان (راولپنڈی) منتقل ہوا۔ اس کے بعد ادیب، فاضل اور سیالکوٹ سے بی اے آنرز کیا۔ والد کا انتقال ۱۹۶۵ء میں وہیں بدایوں میں ہوا۔ دورانِ تعلیم شکیب کو بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ والد کی گھریلو معاملات سے بے نیازی اور ذہنی عدم توازن، غربت اور مفلسی، چار بہنوں اور گھر کے اخراجات کا بوجھ، ماں کی جدائی کا غم، چھوٹی موٹی ملازمتوں کے لیے در در کے دھکے کھانے کے باوجود حوصلے کے ساتھ تعلیمی اور معاشی تگ و دو کرتا رہا۔ اسی دوران ادبی فکر غالب رہی اور کئی ہفت روزوں اور ماہ ناموں کی ادارت کی۔ اسی سلسلے میں لاہور بھی منتقل ہوا اور مختلف اخبارات میں ملازمت کرتا رہا۔ انہی حالات میں تین بہنوں کی شادیاں بھی کیں۔ گھریلو اور معاشی مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے ۱۹۵۸ء میں تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (ٹی ڈی اے) میں شعبۂ تعلقاتِ عامہ سے وابستہ ہوا۔ اس سلسلے میں جوہر آباد اور پھر بھکر میں تعینات رہا۔ اپنوں بیگانوں کی بے قدری اور اجنبیت کے دُکھ بھی جھیلتا رہا۔ خاندانی، ذاتی اور سماجی حالات کی بنا پر (اور شاید اس میں وراثت کے لاشعوری اثرات بھی تھے) شکیب بھی زندگی کے آخری چند برسوں میں (ٹی ڈی اے کی ملازمت کے دوران) نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہونا شروع ہوا اور انہی نفسیاتی وجوہات کی بنا پر ۱۲ر نومبر ۱۹۶۶ء کو صرف ۳۲ سال کی عمر میں سرگودھا کے مقام پر اپنے آپ کو ریل گاڑی کے آگے ڈال کر (اس کے والد نے اس کی والدہ کو ریل گاڑی کے آگے ڈالا تھا) خودکشی کی اور وہیں دفن ہوا۔(۱۰)

شکیب جلالی نے غزل، نظم، قطعہ، رباعی میں طبع آزمائی کی۔ غیر ملکی افسانوں کے تراجم، مضامین اور صحافت میں بھی کمال حاصل کیا۔ لیکن ایک غزل گو کی حیثیت سے مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ اس کی نظموں میں متغزلانہ مزاج موجود ہے۔ اس کا شعری وجود سرتاپا غزل کے پیکر میں ڈھلا ہوا ہے۔ وہ اول و آخر ایک غزل گو ہے۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ اس کی وفات کے کافی بعد ۱۹۷۲ء میں احمد ندیم قاسمی کے مکتبہ فنون سے ''روشنی اے روشنی'' کے نام سے شائع ہوا۔ تاہم اس کا نام خود شکیب نے تجویز کیا تھا (یعنی یہ انتخاب شکیب نے اپنی زندگی ہی میں ترتیب دے لیا تھا)(۱۱) اس کے بعد اس کے کئی مجموعے ماوراء

سے شائع ہوئے۔اس میں ۷۰غزلیں،۲۱نظمیں اور متفرق اشعار شامل ہیں۔۲۰۰۴ء میں شکیب کے صاحبزادے اقدس رضوی نے ''کلیاتِ شکیب جلالی'' مرتب کر کے سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع کرایا۔ اس میں غزلیات (۲۲۳)، نظمیں (۶۵)، کچھ قطعات ور باعیات (۵۳+۳۰) اور بچوں کے لیے ۳نظمیں شامل ہیں۔اقدس رضوی نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ انہوں نے تمام کلام ممکنہ حد تک سن وار یا سنِ اشاعت کے ساتھ ترتیب دینے کی کوشش کی ہے تا کہ ارتقائی مراحل واضح ہو جائیں (۱۲)لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔اس لیے کہ اس میں ''روشنی اے روشنی'' کا تمام کلام بغیر سن یا تاریخ اشاعت کے جوں کا توں شامل کر لیا گیا ہے جبکی باقی ماندہ کلام بھی کہیں سنِ اشاعت یا سنِ تخلیق کے ساتھ ہے اور کہیں اس کے بغیر، تاہم موجودہ کلیات کی شکل میں اس کی تحقیقی وادبی افادیت سے انکار ناممکن ہے اور شکیب جلالی کا تمام کلام منظرِ عام پر لانا ان کا کارنامہ ہے۔

شکیب جلالی کے مندرجہ بالا سوانحی اور تخلیقی منظر نامے کو نظر میں رکھیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ محض ۳۲ برسوں پر محیط جواں مرگ شکیب کی زندگی میں آسودگی کا نشان نہیں ملتا۔ ماں کی سفاکانہ انداز میں موت اور اس کا اثر، پھر باپ کی موت، بچپن ہی میں ماں اور باپ کی محبت سے محرومی، معاشی عفریت کا پہاڑ، کم سنی ہی میں گھریلو ذمہ داریاں، ملازمتوں کے دھکے، اپنوں بیگانوں کے منافقانہ رویے، احساسِ تنہائی، احساسِ محرومی، آزردگی، اداسی، ذہنی انتشار، دکھوں اور پریشانیوں کے باوجود حوصلہ اور امید کے ساتھ مسلسل معاشی تگ ودو، علمی وادبی لگن، گھریلو اور پیشہ وارانہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش غرض ایک تشخص ابھرتا ہے جو تمام تر نا آسودگیوں کے باوجود باحوصلہ اور عزم وہمت کا حامل ہے۔نفسیاتی الجھنوں کے باوجود اخلاقی اعتبار سے ایک مکمل انسان ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ذہنی ناہمواریوں کے باوصف اس کی ازدواجی زندگی خوشگوار ہے اور وہ ان الجھنوں کا سایہ بھی اپنے گھر بار اور بیرونی دنیا پر نہیں پڑنے دیتا اور خاموشی سے موت کو گلے لگا لیتا ہے۔وسیع المطالعہ، شعروادب کا عاشق، حساس طبع، سیمابی فطرت، احساس ذمہ داری سے لبریز، خوددار، وضع دار، بااعتماد، دروں بین، داخلیت اور انفرادیت پسند، بحیثیت باپ، شوہر، بیٹا اور بھائی محبت کرنے والا، انسان دوست، غمگسار اور ہمدرد لیکن خود محرومیوں اور زندگی کے خوف سے لبریز حوصلہ اور جدوجہد کا قائل.....غرض ایک ایسے انسان کی تصویر ابھرتی ہے جو بحیثیت انسان مکمل ہے لیکن نفسیاتی طور پر غیر متوازن ہے۔ان سب اثرات نے اس کی تخلیقی شخصیت، مزاج، لب ولہجہ اور آہنگ متعین کیا ہے۔اس کی شخصیت کی اس تعمیر میں اس کے دور کے سیاسی وسماجی ملکی وبین الاقوامی حالات کا بھی عمل دخل ہے۔

جنگِ عظیم اول اور جنگِ عظیم دوم کے بعد کی پر آشوب سیاسی، سماجی، معاشی اور ذاتی صورتحال، براہِ راست نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کے بعد امریکہ کا شکل بدلتا ہوا جدید ترین اور پیچیدہ ترین نوآبادیاتی نظام اور اس نظام میں سارتر کے الفاظ میں پسماندہ نوآبادیات کا شکستہ فاقہ زدہ، بیمار، خوف زدہ ''دیسی باشندہ''(۱۳) انسانی خون کی ارزانی، انسانی وقار کی بے حرمتی، سامراج کا جبر وتشدد، موت کے سائے، اقدار کا زوال، دکھ، اذیت، خوف، کرب مسلسل، مایوسی وناامیدی، بے یقینی، زندگی کی بے معنویت ولایعنیت، ذہنی انتشار، اعصابی خلل، نفسیاتی الجھنیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، صنعتی عہد میں فرد کے

مشین بن جانے اور اجتماع میں گم ہو جانے کا احساس، سائنسی عروج اور اس کے نتیجے میں قدیم آدرشوں کی شکست و ریخت اور تشکیک کی کیفیت، کائنات کی وسعتوں میں فرد کی کم مائگی اور احساسِ تنہائی، جمہوریت اور آزادی کے نام پر آمریتوں کا استبداد اور تشدد، شخصی آزادی کی ٹوٹ پھوٹ، منافقت، جھوٹ، تضاد، نفرت، مکر و فریب، بے سکونی، غرض لاتعداد عناصر تھے جو عصری ادب کو متاثر کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ مغربی مفکرین کے متنوع نظریات اور فلسفے جیسے وکٹر ہیوگو، والٹر، کارلائل، زولا، ہیگل، مارکس، فرائڈ، گورکی، ٹالسٹائی، چیخوف، میلارمے، بودلیئر اور دوسرے فرانسیسی علامت پسندان کے سب کے اثرات۔ ان کے زیرِ اثر چلنے والی تحریکیں اور رجحانات و رویے مثلاً ترقی پسند ادبی تحریک، حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک، وجودیت کی تحریک اس کے ساتھ تحلیلِ نفسی، جنسی نفسیات اور شعور سے لاشعور تک کے سفر کے رویے اور رجحانات۔ پھر برصغیر میں چلنے والی تحریک آزادی اور اس سے متعلقہ واقعات و حادثات، تقسیمِ ہند، ہجرت، فسادات، پاکستان میں قیام پاکستان کے بعد مارشل لا اور اس کا استبداد، تشدد کی فضا، معاشی عدم مساوات، سیاسی جبریت، بے اطمینانی اور خوابوں کی شکست و ریخت، اس کے نتیجے میں فرد کا زوال، اخلاقی انحطاط، اقدار کی تباہی اس کے اثر سے فرد کے اندر پیدا ہونے والی دروں بینی اور انفرادیت پھر ان حالات کے تحت ابھرنے والی جدیدیت، علامت و تجرید اور داخلیت پر مبنی ادبی رجحان غرض یہ وہ سیاسی سماجی ادبی منظر نامہ ہے جس میں شکیب جلالی کی غزل اور تخلیقی شخصیت نے جنم لیا ہے۔ ان تمام ذاتی و سوانحی اور خارجی اثرات کو اس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں محسوس کیا ہے اور اپنے دور کے جبر اور حالات کی ستم ظریفی کو خلاقانہ سطح پر اس طرح سمویا ہے کہ اس کی غزل نہ صرف اپنے دور کی ترجمانی کرتی ہے بلکہ زمانے کی قید سے آزاد ہو کر آفاقی سطح پر پہنچ گئی ہے۔ تاہم اس کی غزل براہِ راست اس کے ذاتی حالات سے وابستہ ہے جس طرح اس کی شخصیت اور شاعری میں کوئی فاصلہ نہیں۔ اسی طرح اس کے ذاتی حالات اور خارجی حالات میں کوئی فاصلہ نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے عہد کی تنہائی، اداسی، میکانیت و لایعنیت، بے چینی، کشیدگی، تشویش اور اس میں ایک امید، جدوجہد، مزاحمت اور احتجاج، مادہ پرستی، مشینیت، آمریت کے جبر، اقدار کے زوال، ہولناک جنگوں، تباہ کن ہتھیاروں، شدید سماجی انقلاب کا نتیجہ ہے۔ اس نے ان سب کو اپنی داخلی روح کے ذریعے بیان کیا ہے اور اس کا اظہار کہیں علامتوں، کہیں استعاروں، کہیں کلاسیکی تلازموں میں کیا ہے یہ علائم رموز اس نے اپنے گردوپیش سے اخذ کیے ہیں۔ چنانچہ اس کی غزل کا نغمہ دل سے پھوٹتا ہے اور پھر اس کی لہریں پورے معاشرے کی فضا میں پھیل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل بے حد داخلی ہونے کے باوجود بے حد خارجی بھی ہے۔ یہ ہماری زندگی، ہمارے مزاج، ہمارے عہد اور ہماری زمین سے ہم آہنگ ہے۔ شکیب جلالی کی غزل اپنے انہی اوصاف کی بنا پر اردو غزل کی روایت میں ۱۹۵۸ء (پہلا مارشل لا) کے آس پاس چلنے والی تحریکِ جدیدیت و علامت نگاری کی نمائندہ بلکہ سرکردہ بن کر سامنے آتی ہے اور جدیدیت کا تمثال آفریں نغمہ بن کر ابھرتی ہے۔ شکیب اردو غزل میں متوازن جدیدیت کا علمبردار بلکہ بانی ہے۔ اس کی غزل کا مطالعہ گویا اردو غزل میں جدیدیت کے مطالعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے مندرجہ بالا بیانات کی تصدیق کے لیے یہ شعر دیکھئے جو ان کا سوانحی استعارہ بھی ہے اور عصرِ حاضر کا فکری مرقع بھی:

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

(کلیاتِ شکیب جلالی، ص ۱۱۸)

اور یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے:

یہ آدمی ہیں کہ سائے ہیں آدمیت کے
گزر ہوا ہے مرا کس اجاڑ بستی میں

وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے
کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

کنارِ آب کھڑا خود سے کہہ رہا ہے کوئی
گماں گزرتا ہے، یہ شخص دوسرا ہے کوئی

میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں
مرجھا کے آ گرا ہوں مگر سرد گھاس میں

وہاں کی روشنیوں نے بھی ظلم ڈھائے بہت
میں اس گلی میں اکیلا تھا اور سائے بہت

دنیا والوں نے چاہت کا مجھ کو صلہ انمول دیا
پیروں میں زنجیریں ڈالیں ہاتھوں میں کشکول دیا

کیا کہیے اب اس کی صدا تک نہیں آتی
اونچی ہوں فصیلیں تو ہوا تک نہیں آتی

سر ٹپک کر درِ زنداں پہ صبا نے یہ کہا
ہے دریچہ نہ کوئی روزنِ دیوار یہاں

عہد و پیمانِ وفا، پیار کے نازک بندھن
توڑ دیتی ہے زر و سیم کی جھنکار یہاں

(کلیاتِ شکیب جلالی، ص ۱۱۲، ۱۰۶، ۱۱۷، ۱۲۱، ۱۲۷، ۱۴۴، ۱۴۰)

حلقہ ارباب ذوق کے زیرِ اثر ن۔م۔راشد اور میراجی نے جدیدیت کی جس رو کو قبول کر کے اردو نظم میں پیش کیا تھا قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۵۸ء کے آس پاس جدیدیت کی اس رو نے ایک رجحان بلکہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ غزل میں سب سے پہلے شکیب جلالی نے اسے اپنی مکمل شکل میں پیش کیا۔ ۱۹۵۸ء میں ملک میں پہلا مارشل لا لگا۔ مارشل لا نے غیر مستحکم سیاسی صورتحال اور جاگیردارانہ سرمایہ دارانہ طبقاتی نظام کی خرابیوں سے ابتر معاشرے کو سنبھالا دینے کی بجائے اور زیادہ تباہی کی طرف گامزن کر دیا۔ ایک سیاسی اور فکری خلا پیدا ہوا۔ خوف اور بے سمتی کی فضا نے جنم لیا جس کے نتیجے میں معاشرے کا رُخ خارج سے باطن کی طرف مڑ گیا۔ داخلیت، نئی مابعد الطبیعاتی فکر، دروں بینی، شناخت کا بحران، غیر نظریاتی ہونا، نئی لسانی تشکیلات، علامت و تجرید، استعارہ سازی، غرض جدیدیت کی انہی ادبی بحثوں نے سارے ادبی معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ آمریت کی جبریت، تشدد کی فضا، معاشی عدم مساوات، سیاسی استبداد، خوف اور بے سمتی کی فضا ساٹھ کی دہائی کی نسل کو ورثے میں ملے تھے۔ اس میں ملکی و بین الاقوامی سیاسی و سماجی، معاشی اور انفرادی منظر نامہ بھی عوامل کے طور پر شامل تھا۔ جدیدیت کو اسی وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے (جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے) جدیدیت ایک رویہ، ایک تاریخی تصور اور ایک ادبی نقطۂ نگاہ ہے۔ انفرادیت، فرد کی داخلی ٹوٹ پھوٹ کا تجزیہ، لاحاصلی و بے معنویت، نظریے سے گریزاں، صنعتی معاشرے میں پائی جانے والی زندگی کی میکانیت و یکسانیت اور اجتماع میں بھی احساسِ تنہائی، سرمایہ دارانہ نظام اور سیاسی

جبریت کے خلاف احتجاج اور مزاحمت، پرانی قدروں سے بے اطمینانی، اس کے ساتھ ساتھ ماضی کی صحت مند اقدار کی بازیافت، دیہات کی بجائے شہر کی طرف رخ، مشینی دور میں فرد کے مشین بن جانے یعنی فرد کی موت کا احساس، نفسی دروں بینی، جنسیت، نئی حسیت، اشاریت، رمزیت، علامت و تجرید، نئی لسانی تشکیلات، فطرت اور زمین کی طرف رجحان..... غرض جدیدیت انہی عناصر و عوامل سے مرکب ہے۔

جدیدیت جب انتہا پسندی یا خامی کا شکار ہوتی ہے تو اس میں خارجی اور اجتماعی زندگی سے گریز، حد درجہ داخلیت اور نفسی دروں بینی، زندگی کا کربِ مسلسل، فرد کی نا آسودگی اور محرومی، نظریاتی سطح پر دھندلکے کی کیفیت، ابہام اور اشاریت، مایوسی، موت کا عنصر زیادہ ابھر آتا ہے جبکہ متوازن جدیدیت داخل کے ساتھ خارج، فرد کی فطری آزردگی کے ساتھ امید، فرد کے ساتھ معاشرے، لفظ کے ساتھ خیال، ماضی کے ساتھ مستقبل کا خیال رکھتی ہے تاہم جدیدیت بنیادی طور پر داخل سے خارج کی طرف سفر کرتی ہے۔ یہی جدیدیت کا توازن ہے۔ (۱۴) شکیب جلالی اسی متوازن جدیدیت کا غزل گو شاعر ہے۔

جدیدیت اور علامت کے اس دور میں غزل نے اگرچہ اپنے روایتی ڈھانچے سے کوئی بڑا انحراف نہیں کیا لیکن اس کے موضوعات ولفظیات میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور کسی بندھے ٹکے نظریے کی بجائے ذات کے تشخص اور اندرونی شکست وریخت کے مضامین نمایاں ہوئے۔ فردیت اور دروں بینی کی خود تشخیصی کا عمل نمایاں ہوا۔ جس کے نتیجے میں اس عہد کی غزل اور اس سے کچھ پیچھے کی غزل میں صدیوں کا فاصلہ قائم ہوگیا۔ ''یہ صدیوں کا فاصلہ شکیب جلالی ہی قائم کر سکتے تھے'' اس لیے وہ جدیدیت کے ابتدائی شاعروں میں سے ہیں'' بلکہ انہیں جدید شاعروں کے معماروں میں شمار کرنا چاہیے''۔ (۱۵)

جدیدیت کے مندرجہ بالا تمام تر پس منظر و منظر، موضوعات و اسالیب، مباحث، رجحانات اور رویوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے شکیب جلالی کے محض چند اشعار پر غور فرمایئے یہ اشعار ہمارے مندرجہ بالا بیانات کی تصدیق و تائید کے لیے کافی و شافی ہیں:

شکیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

بٹا سکے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی
یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

خزاں کے چاند نے پوچھا یہ جھک کے کھڑکی میں
کبھی چراغ بھی جلتا ہے اس حویلی میں

ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں ہاتھ سے پتوار گرے

وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں
خود اپنی چاپ سن کر لرزہ براندم ہو جائے

شفق جو روئے سحر پر گلال ملنے لگی
یہ بستیوں کی فضا کیوں دھواں اگلنے لگی

دیکھ زخمی ہوا جاتا ہے دو عالم کا خلوص
ایک انساں کو تری ذات سے دکھ پہنچا ہے

کس دشت کی صدا ہو اتنا مجھے بتا دو
ہر سو بچھے ہیں رستے آؤں تو میں کدھر سے

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے　　مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے
ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے　　چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

(کلیات شکیب جلالی،ص۱۱۷،۱۳۳،۱۲۳،۱۱۲،۱۰۶،۱۳۳،۳۳۵،۱۵۹،۱۳۰،۱۷۹)

شکیب جلالی احساسِ ناآسودگی کا شاعر ہے۔وہ زندگی کی تنہائی، خاموشی، ویرانی، اجاڑپن، محرومی، شکست خوردگی اور بے گھری کا شاعر ہے۔یہ احساسِ کرب وتنہائی اس کے ذاتی حالات کا پیدا کردہ بھی ہے، صنعتی معاشرے کے نظامِ زر اور طبقاتی تفاوت کے سبب بھی۔

گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا　　ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا
ستارے سسکیاں بھرتے تھے اوس روتی تھی　　فسانۂ جگرِ لخت لخت ایسا تھا
قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا　　میں آبِ جو کے کنارے اداس بیٹھا تھا
میں نے اسے شریک سفر کرلیا شکیب　　اپنی طرح سے چاند جو بے گھر لگا مجھے
اسی لیے تو ہوا روپڑی درختوں میں　　ابھی میں کھل نہ سکا تھا کہ رت بدلنے لگی
وہ خموشی انگلیاں چٹخا رہی تھی اے شکیب　　یا کہ بوندیں بج رہی تھیں رات روشندان پر
میں شاخ سے اڑا تھا ستاروں کی آس میں　　مرجھا کے آ گرا ہوں مگر سرد گھاس میں
صحر کی بودوباش ہے اچھی نہ کیوں لگے　　سوکھی ہوئی گلاب کی ٹہنی گلاس میں

(کلیات شکیب جلالی،ص۱۰۵،۱۳۵،۱۰۸،۱۱۹،۱۲۱)

اس کی شاعری زندگی کے زوال وفنا، بے ثباتی وعارضی پن کے احساس کی داستان ہے۔کائنات کی وسعتوں میں ہاتھ پاؤں مارتے جدید انسان کی بے بسی اور المیے کی کہانی ہے۔موت کے خوف سے لرزاں جدید ذہن ودل اور لاشعور کا قصہ ہے۔ان کائناتی مصائب کو وہ ذاتی مصائب اور ذاتی تجربے کے روپ میں پیش کرتا ہے۔

عالم میں جس کی دھوم تھی اس شاہکار پر　　دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ
بچھتی تھیں جس کی راہ میں پھولوں کی چادریں　　اب اس کی خاک گھاس کے پیروں تلے بھی دیکھ
مرجھا کے کالی جھیل میں گرتے ہوئے بھی دیکھ　　سورج ہوں میرا رنگ مگر دن ڈھلے بھی دیکھ
دیکھ کر اپنے در و بام گزر جاتا ہوں　　مرے ہمسائے میں جب بھی کوئی دیوار گرے
جھکی چٹان، پھسلتی گرفت، جھولتا جسم　　میں اب گرا ہی گرا تنگ و تار گھاٹی میں
وقت کی ڈور خدا جانے کہاں سے ٹوٹے　　کس گھڑی سر پہ یہ لٹکی ہوئی تلوار گرے

(کلیات شکیب جلالی،ص۱۰۳،۱۰۶،۱۱۲،۱۰۶)

اگرچہ اداسی، تنہائی، ویرانی، بنجرپن، شکست خوردگی شکیب کے کلام میں غالب عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں تاہم اس

کی شاعری قنوطیت کی حامل نہیں۔شکیب ساری زندگی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا۔یہی حوصلہ، امید، جدوجہد اس کی غزل میں موجود ہے۔وہ افسردگی کا مریض نہیں بلکہ یہ ایسی افسردگی یا اداسی ہے جو مصائب میں انسانی فطرت کا خاصہ ہے یہی وجہ ہے اس کی تنہائی، اداسی، ویرانی عالمگیر آفاقی حیثیت اختیار کر جاتی ہے جس میں وسیع انسانی ہمدردی اور غم گساری ہے۔فنی سطح پر اس کی شاعری یہ فریضہ اپنے علامتی اسلوب میں المیے کے کتھارسس کی طرح سرانجام دیتی ہے۔یہی وجہ ہے اس کی شاعری نا آسودگی سے آسودگی کی طرف سفر کرتی ہے۔بلکہ موت کو زندگی، تنہائی کو مجلس، نا آسودگی کو آسودگی، مایوسی کو امید میں بدلنے دینے کا استعارہ ہے۔اس کی غزل عالی ہمتی اور عالی حوصلگی کی حامل ہے۔یہ کشاکش حیات میں زندہ رہنے کا قرینہ سکھاتی ہے۔امید ونشاط، ولولہ وجوش کو بیدار کرتی ہے۔اس کی شاعری زندگی کے جلتے صحرا میں جہدِ حیات اور گرمیِ حیات کی شاعری ہے۔اس کی شاعری اندھیر سے روشنی کی طرف سفر کرتی ہے۔وہ ''روشنی کا مغنی اور کرن کرن کا سفیر'' ہے[۱۶] صنعتی طبقاتی معاشرے کی ظلمتوں میں روشنیوں کا متلاشی اور روشنیوں کو تخلیق والا شاعر ہے (یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے مجموعے کا نام بھی ''روشنی اے روشنی رکھا ہے)۔یہ ساری روشنیاں اس کے وجود سے پھوٹتی ہیں اور پورے سماج کو روشن کر دیتی ہیں۔اس کے ہاں اندھیروں میں بھی روشنی کے نقطے نظر آتے ہیں۔وہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کے چشمے تلاش کر لیتا ہے۔جلتے ہوئے پروں سے محوِ پرواز رہتا ہے۔اس کے ہاں چاند ڈوبتا ہے تو سورج ابھرتا ہے۔وہ آندھیوں میں بھی پتھر کی اوٹ لے کر چراغ جلاتا ہے۔وہ ریشۂ گل سے پہاڑ کاٹتا ہے، حشر برپا ہو تو دل کی کھڑکیاں کھول دیتا ہے۔چاہے اس کا پاؤں زخمی ہو جائے لیکن وہ ٹھوکر سے کوہسار ہٹا دیتا ہے۔کتنے ہی طوفان اٹھیں، کتنے ہی ستارے ٹوٹیں اس کا دلِ بیدار نہیں ڈوبتا۔راستے کا اندھا چراغ بجھ جائے تو لہو کے شرار جلاتا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل حالات میں بھی جلتے صحراؤں کے لیے پیڑوں کا سایہ بن جاتا ہے۔

ادھر سے بارہا گزرا مگر خبر نہ ہوئی
کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا

شبِ سفر تھی قبا تیرگی کی پہنے ہوئے
کہیں کہیں یہ کوئی روشنی کا دھبہ تھا

حسنِ فردا غمِ امروز سے ضو پائے گا
چاند ڈوبا ہے تو سورج بھی ابھر آئے گا

اے بادِ تند! وضع کے پابند ہم بھی ہیں
پتھر کی اوٹ لے کے جلائیں گے اب چراغ

کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو
کیا بجھ گیا ہوا سے لہو کا شرار بھی

ہر چند راکھ ہو کے بکھرنا ہے راہ میں
جلتے ہوئے پروں سے اڑا ہوں مجھے بھی دیکھ

اک حشر سا بپا تھا مرے دل میں اے شکیب
کھولیں جو کھڑکیاں تو ذرا شور گھٹ گیا

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور
رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

تیشے کا کام ریشۂ گل سے لیا شکیب
ہم سے پہاڑ کاٹنے والے ہوئے نہیں

جلتے صحراؤں میں پھیلا ہوتا
کاش میں پیڑوں کا سایہ ہوتا

جب بھی نکلا ستارۂ امید
کہر کے درمیان سے نکلا

(کلیاتِ شکیب جلالی، ص ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۷۷، ۱۹۱، ۱۱۶، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۶۱)

اس کے بعد ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ وہ نا آسودگیوں، اداسیوں اور تنہائیوں کا شاعر ہونے کے باوجود بھی امیدوں اور روشنیوں کا پیامبر ہے۔ گویا وہ روشنیوں اور امیدوں کا شاعر ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کا شاعر ہے۔ زندگی میں اندھیرا بھی ہے روشنی بھی۔ وہ جدیدیت کے اُن انتہا پسند شاعروں کی طرح نہیں جو ظلمتوں، مایوسیوں اور دھندلکوں میں گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اندھیروں سے روشنیوں کی کرنیں تراشتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں جدید صنعتی زندگی، جدید حسیت کا شاعر ہے۔ اس کے ہاں یہ احساسِ تنہائی اس کی ذاتی زندگی کے ساتھ مشینی دور کی مصروف زندگی کی بھی دین ہے۔ اس کی زندگی بھی تو اسی مشینی عہد کی پیدا کردہ ہے چنانچہ یہ اضطراب و بے چینی یہ نا آسودگی و محرومی معاشرے کی نا آسودگی ہے۔ اس لیے یہ اس کی خامی نہیں بلکہ ہمارے دور کی زندگی کا ایک رنگ ایک کرب ہے۔

حقیقت یہ ہے اس نے زندگی کی انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں کو اپنے مخصوص انفرادی اور نئے علامتی اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں ہمارے عہد کے عام انسان کے حقیقی کرب کو تخلیقی اظہار کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس کا دُکھ، درد، کرب، آشوب محض تخیلی نہیں بلکہ ہماری دھرتی ہمارے اسی جدید ماحول سے ابھرا ہے۔ اس کی شاعری میں انسان اپنی تمام محبتوں، نفرتوں، دکھوں، خوشیوں، امیدی و نا امیدی، سچائیوں اور منافقتوں کے ساتھ سچے اور کھرے انداز میں موجود ہے۔ وہ آج کے عہد کے انسان کی پیچیدہ اور پر آشوب صورتحال کو دلکش تخلیقی و جمالیاتی انداز میں بیان کرتا ہے۔ شکیب نے آج کے عہد کے انسان کی داخلی شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے۔ اس نے انسان کے زوال کا سبب روایت، معیشت، سیاست اور کائنات کے جبر کو قرار دیا ہے آج کا معاشرہ جس طور بے اقداری کا شکار ہوا، اور انسان اس منافقتوں بھرے استحصال کرنے والے معاشرے میں تنہائی جیسے دکھ میں مبتلا ہوا یہ سب شکیب کی غزل کے موضوعات ہیں۔ اس نے فرد کے آشوب بلکہ اپنے ذاتی آشوب کے حوالے سے عہدِ حاضر کے انسان کے کرب کو نئی اور منفرد علامتوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اس لیے وہ صرف جدید شاعری نہیں جدیدیت کے فلسفے کا علمبردار بھی ہے۔ اس صنعتی مشینی دور میں انسان محض ایک مشین کا پرزہ، ایک پیداواری عامل، ایک چلتا پھرتا مردہ بن کر رہ گیا ہے۔ اشیا اور تصورات شکست و ریخت سے دوچار ہو گئے ہیں۔ انسانی بستیاں اقدار کے اعتبار سے اجاڑ بستیوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ فرد لخت لخت اور کردار سائے بن چکے ہیں۔ ملبوس خوشنما ہیں جن میں جسم کھوکھلے ہیں اور روح سلوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ آدمیت کا اژدھام ہے لیکن اس کے باوجود اجنبیت اور سناٹے کی گونج ہر طرف سنائی دیتی ہے۔

یہ آدمی ہیں کہ سائے ہیں آدمیت کے — گزر ہوا ہے مرا کس اجاڑ بستی میں
سوچو تو سلوٹوں سے بھری ہے تمام روح — دیکھو تو اک شکن بھی نہیں ہے لباس میں
ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے — چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر
ہوا نے توڑ کے پتّہ زمیں پہ پھینکا ہے — کہ شب کی جھیل میں پتھر گرا دیا ہے کوئی

مکان اور نہیں ہے بدل گیا ہے مکیں — افق وہی ہے مگر چاند دوسرا ہے کوئی
کمرے خالی ہوگئے، سایوں سے آنگن بھر گیا — ڈوبتے سورج کی کرنیں جب پڑیں دالان پر
اب یہاں کوئی نہیں ہے، کس سے باتیں کیجیے — یہ مگر چپ چاپ سی تصویر آتشدان پر

(کلیات شکیب جلالی، ص۱۲۱، ۱۲۴، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹)

اس کے ہاں جدید معاشرے میں پائی جانے والی منافقت، جھوٹ، تضاد، نفسیاتی الجھنوں، تشکیک اور ذہنی جذباتی سناٹے کی فضا ہے۔ بے حسی اور بیگانگی کا عالم یہ ہے کہ کوئی مرجھائی ہوئی کلی کی تربت اور ہوا کا نوحہ سننے کو بھی تیار نہیں۔

بنی نہیں جو کہیں پر کلی کی تربت تھی
سنا نہیں جو کسی نے ہوا کا نوحہ تھا

(کلیاتِ شکیب جلالی، ص۱۱۰)

شکیب جدید مشینی عہد کا شاعر ہے۔ وہ دیہاتوں کے بجائے شہر کو، شہر کی چمنیوں اور ملوں کو اور ان سے اٹھنے والے دھوئیں کو موضوع بناتا ہے۔ یہ وہ شہر ہیں جن میں مشینوں، کارخانوں اور آوازوں کا شور ہے۔ ان آوازوں میں انسان تنہا کھڑا ہے۔ بستیوں کی فضا میں اور روئے سحر میں شفق کی بجائے دھوئیں کی آلودگی ہے۔ انسانوں کی دنیا ان کے دلوں کی طرح چھوٹے چھوٹے خانوں میں بٹ گئی ہے۔ اس عہد کا انسان مشین کی طرح دل کا سخت اور لہجہ کا کرخت ہے۔

شفق جو روئے سحر پر گلال ملنے لگی — یہ بستیوں کی فضا کیوں دھواں اگلنے لگی
لگتا تھا بے کراں مجھے صحرا میں آسماں — پہنچا جو بستیوں میں تو خانوں میں بٹ گیا
ذرا نہ موم ہوا پیار کی حرارت سے — چٹخ کے ٹوٹ گیا دل کا سخت ایسا تھا
یہ اور بات کہ وہ لب تھے پھول سے نازک — کوئی نہ سہہ سکے، لہجہ کرخت ایسا تھا

(کلیات شکیب جلالی، ص۱۰۸، ۱۳۸، ۱۰۵، ۱۱)

شکیب کی غزل ۱۹۵۸ء کے آس پاس کی ہے۔ ملک میں یہ مارشل لاء اور سیاسی استبداد کا دور ہے۔ تشدد، عدم معاشی مساوات، سیاسی جبریت، گھٹن اور خوف و دہشت کی فضا میں فرد اندر ہی اندر گھٹ رہا ہے۔

ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں ہاتھ سے پتوار گرے

(کلیاتِ شکیب جلالی، ص۱۰۶)

لیکن اس کے ساتھ ساتھ رمز و ایما اور اشاروں اشاروں میں احتجاج اور مزاحمت بھی جاری ہے۔ جنت ارضی قفس رنگ بن کر رہ گئی ہے لیکن اس کے ساتھ باب قفس کو توڑنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ شکیب سامراجیت اور آمریت سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ رجعت پرستی ہو سکتی ہے، جدیدیت نہیں۔ اس کے ہاں سیاسی سماجی شعور اعلیٰ فنی جمالیاتی معیار کا

روپ ڈھال کر سامنے آتا ہے۔ اسے اندازہ ہے کہ یہ خطہ ارضی ایک زنداں کی شکل اختیار کر چکا ہے جس میں نہ کوئی دریچہ ہے نہ کوئی روزن۔ تیرگی سے قندیل رخ یار بجھ چکی ہے۔ وہ معاشرہ جہاں پتھر کے ہونٹ بھی گفتگو کرتے تھے، بے نغمہ وصدا ہو چکا ہے۔ شکیب ان حالات سے بغاوت کرتا ہے۔ احتجاج اور مزاحمت کرتا ہے اور عوام الناس کو آزادی کے لیے آمادہ کرتا ہے جبھی تو وہ جھنجھلا کر کہتا ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کہکشاں کو مروڑ کر رکھ دوں جو روشنی کی بجائے ظلمتوں کی خالق ہے:

جی میں آتا ہے اے رہ ظلمت — کہکشاں کو مروڑ کر رکھ دوں
لہو لہو ہوں سلاخوں سے سر کو ٹکرا کر — شکیب، بابِ قفس، کیا کہوں کس آن کُھلا
سر پٹک کر درِ زنداں پہ صبا نے یہ کہا — ہے دریچہ نہ کوئی روزنِ دیوار یہاں
تیرگی ٹوٹ پڑی، زور سے بادل گرجا — بجھ گئی سہم کے قندیل رخ یار یہاں
بے نغمہ و صدا ہے وہ بتخانۂ خیال — کرتے تھے گفتگو جہاں پتھر کے ہونٹ بھی
ہاں، کوہِ شب کو کاٹ کے لانا ہے جوئے نور — ہاں بڑھ کے آفتاب کا تیشہ سنبھالیے
ضربِ خیال سے کہاں ٹوٹ سکیں گی بیڑیاں — فکرِ چمن کے ہمرکاب جوشِ جنوں بھی چاہیے

(کلیات شکیب جلالی، ص ۱۱۴، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۷۶، ۱۷۴، ۱۷۰)

یہ سارے سماجی سیاسی حالات صنعتی دور کے نظام زر نے پیدا کیے ہیں۔ جدید سرمایہ دارانہ نظام میں پوری دنیا دو طبقوں میں بٹ چکی ہے۔ بورژوا طبقہ اور پرولتاریہ طبقہ، شکیب ان معاشی ناہمواریوں اور طبقاتی کشمکش پر تنقید کرتا ہے۔ ہمارا عہد جوہری توانائی کا عہد ہے۔ اس میں سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی جنگ زرگری ہے۔ اسی سرمایہ دارانہ نظام نے وسیع پیمانے پر قرضوں کا جال بچھا کر کمزور اقوام وعوام کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لیا ہے۔ تنہائی، بے چارگی، مفلسی، بے بسی، اسی نظام زر کا عطیہ ہیں۔ یہ کلچر پلاسٹک کلچر ہے۔ انسانی رشتے لین دین میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جدیدیت اسی سرمایہ دارانہ نظام کا ردِعمل ہے۔ شکیب جلالی اسی سرمایہ دارانہ نظام کا ردِعمل ہے۔ اس نے جگہ جگہ اس طبقاتی کشمکش اور سرمایہ دارانہ نظام کی چیرہ دستیوں کو آشکار کر کے ان پر تنقید کی ہے۔ ان کے خلاف بغاوت، مزاحمت اور احتجاج کیا ہے اور اس کو انتہائی حسین وجمیل نغمہ ورنگ میں سمو کر پیش کیا ہے۔ مثلاً:۔

یہ کیا کہ دل کے دیپ کی لَو ہی تراش لی — سورج اگر ہے، کرنوں کی جھالر لگا مجھے
عہد و پیمانِ وفا، پیار کے نازک بندھن — توڑ دیتی ہے زر و سیم کی جھنکار یہاں
ننگ و ناموس کے بکتے ہوئے انمول رتن — لب و رخسار کے سجتے ہوئے بازار یہاں
کشتیِ زیست سلامت ہے نہ پتوار یہاں — موج در موج سو رنگ کے منجدھار یہاں
کہتا ہے آفتاب، ذرا دیکھنا کہ ہم — ڈوبے تھے گہری رات میں، کالے ہوئے نہیں
گیسوئے زیست کے یہ الجھاؤ — آؤ مل کر شکیب سلجھائیں

(کلیاتِ شکیب جلالی، ص ۱۳۶، ۱۴۰، ۱۱۱، ۱۴۶، ۲۸۸)

ایسا اس لیے بھی ہے کہ زندگی اس کے نزدیک متحرک، رواں دواں ہے۔ یہ سفر کا استعارہ ہے۔ دشتِ مسافت میں عزم و ہمت کی علامت ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ شکیب انسان دوست، غمگسار اور ہمدرد ہے۔ وہ تو پڑوس میں رہنے والے کچھ ملول سے چہروں کی دل آزاری اور احساس محرومی کے خوف سے ڈھولک کی تھاپ کو بھی تیز نہیں ہونے دیتا۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ وہ خوددار ہے وہ اگر گرتا بھی ہے تو اپنے ہی قدموں میں گرتا ہے:

اتر کے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا
زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

میں ناپتا چلا قدموں سے اپنے سائے کو
کبھی جو دشتِ مسافت میں دھوپ ڈھلنے لگی

اتنا نہ تیز کیجیے ڈھولک کی تھاپ کو
رہتے ہیں کچھ ملول سے چہرے پڑوس میں

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

(کلیاتِ شکیب جلالی، ص ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۳۲، ۱۰۶)

شکیب نے جدیدیت کا علمبردار ہونے کے ناطے محبت اور عشق کو بھی موضوع بنایا ہے لیکن اس کو روایتی انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ جدید ترین انداز میں جنسی نفسیات اور جنسی لاشعور کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل اس نے روایتی رنگ میں اپنے جدید رنگ، جدید علامات کو شامل کیا ہے۔ اس نے نازک اور پیچیدہ جنسی نفسیاتی وارداتوں اور جنسی جذبات کو مجسم کر کے پیش کیا ہے۔ اس میں خلوص ہے، صداقت ہے اور اس کے ذاتی تجربے کا عنصر اور احساس ہے۔

کسی کا جسم اگر چھو لیا خیال میں بھی
تو پور پور مری، مثلِ شمع جانے لگی

مری نگاہ میں خواہش کا شائبہ بھی نہ تھا
یہ برف سی مرے چہرے پہ کیوں پگھلنے لگی

وہ اس کا عکسِ بدن تھا کہ چاندنی کا کنول
وہ نیلی جھیل تھی یا آسمان کا ٹکڑا تھا

رہتا تھا سامنے ترا چہرا کھلا ہوا
پڑھتا تھا میں کتاب یہی ہر کلاس میں

کتنا ہی بے کنار سمندر ہو، پھر بھی دوست
رہتا ہے بے قرار ندی کے ملاپ کو

پہلے تو میری یاد سے آئی حیا انہیں
پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو

تعریف کیا ہو قامتِ دلدار کی شکیب
تجسیم کردیا ہے کسی نے الاپ کو

(کلیاتِ شکیب جلالی، ص ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۲۲، ۱۳۲)

مندرجہ بالا جائزے میں ہم نے بعض مقامات پر شکیب جلالی ہی کی علامتوں اور لفظیات کے ذریعے ان کی غزل پر اظہارِ خیال کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے کہ ایک ایسا شاعر جس کی غزل یا شاعری کی بنیاد علامت پر ہو، اس کی روح تک پہنچنے کے لیے ایسا تخلیقی و جمالیاتی اسلوب ہی سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا تجزیہ کرتے ہوئے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں وہ تعداد میں یقیناً زیادہ ہیں۔ ایسا دانستہ طور پر کیا گیا ہے اس لیے کہ انہی اشعار کو مدِنظر رکھ لیا جائے تو صاف اندازہ ہوتا

ہے کہ شکیب کی سب سے بڑی انفرادیت اور مؤثر ہتھیار اس کے سمبل یا اس کی پیکر تراشی اور تمثال کاری ہے۔ یہ علائم و رموز قاری کے ذہن میں ایک مکمل تصویر بنا دیتے ہیں۔ شکیب کسی چیز کے بارے میں بتاتا نہیں بلکہ اس چیز، خیال، جذبے یا احساس کو تجسیم کر کے دکھاتا ہے۔ اس تصویر کے پس منظر میں چھپا ہوا خیال یا جذبہ پورے حسن و جمال کے ساتھ جگمگا اٹھتا ہے ''یہ قوت بہت کم شاعروں کو ودیعت ہوئی ہے اور اس لیے شکیب کی یہ خصوصیت منفرد ہے''(۱۷) اس نے اپنی اچھوتی اور نادر تشبیہات استعارات اور علائم کے ذریعے امیجری یعنی تمثال کاری اور پیکر تراشی کو فن اور جمال کی اعلیٰ منازل سے روشناس کرایا ہے اور اس کو نئے رخوں سے متعارف کرا کے ایک تحریک بنا کر پیش کیا ہے۔ آج بھی کئی عمدہ شعراء کے ہاں شکیب کا لہجہ یا ان کے مضامین یا ان کی طرح کے پیکر اور استعارے جھلملاتے نظر آتے ہیں۔(۱۸) اس کے ہاں سمعی، بصری، مرکب، مفرد، ساکن، حرکی ہر طرح کی تمثالیں ملتی ہیں۔ اس نے نازک سے نازک احساس اور جذبے کو زندہ تصویر میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اس کے ہاں ان دیکھی چیزیں بھی حرکی پیکروں میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔ مزید براں ''وہ سمعی پیکر تراشی جس کا تجربہ ہمیں معاصر غزل گوئی میں خاصا کم ہوتا ہے، شکیب جلالی کی غزلوں میں اس احساس کی فراوانی ملتی ہے.....احساس کی اس جہت سے ہماری آشنائی معاصر غزل میں بہت کم ہوتی ہے''۔(۱۹)

شکیب نئی علامتوں نئی امیجری اور جدید حسیت کو پیش کرنے کے باوجود روایت سے یکسر رشتہ نہیں توڑتا بلکہ جدیدیت کے ساتھ کلاسیکیت کی پاسداری بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں نئی لسانی تشکیلات کے جنون میں غزل لفظی تماشا گری کا شکار ہو کر تخلیقی رچاؤ سے محروم نہیں ہوتی۔ یہ نئی لسانی تشکیلات وہ نہیں ہیں جو ظفر اقبال نے غزل میں متعارف کرانے کی کوشش کی تھی لیکن ان کا یہ تجربہ تادیر قائم نہیں رہ سکا۔(۲۰) شکیب کے ہاں لسانی تشکیلات کا عمل صحیح معنوں میں تشکیلات کا عمل ہے نہ کہ لسانی توڑ پھوڑ کا، ظفر اقبال کی لسانی تشکیلات کے عمل نے نئی نسل کو متاثر کرنے کی بجائے شکیب جلالی کے تجربے نے نئی نسل پر دیرپا اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ شکیب جلالی ہی ہے جس کی غزل ''جدید'' ہونے کے باوجود میر، غالب، اقبال، ذوق، فراق وغیرہ کے عظیم تجربات سے ناطہ نہیں توڑتی۔ یہ صحیح معنوں میں ہمارے ذہن، ہماری نفسیات، ہمارے جذبات، ہمارے ماضی حال اور مستقبل کو اپیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے ''جدید اردو غزل کو جس شاعر نے سب سے زیادہ بصیرت دی اور جس نے محض ۲۵ برس کی عمر میں اپنا منفرد اسلوبِ شعر پیدا کر لیا اور جس نے نہایت خاموشی کے ساتھ آنے والی پوری نسل کو بے پناہ حد تک متاثر کیا وہ شکیب جلالی ہی تھا''۔(۲۱) شکیب جلالی کے ان تجربات کے نتیجے میں جدید اردو غزل کو ایسے راستے، ایسے قرینے میسر آئے کہ وہ سیاسی جبریت، معاشرتی گھٹن، اخلاقی اقدار کے زوال، جنسی و نفسیاتی الجھنیں، معاشی مسائل اور فرد کی داخلی ٹوٹ پھوٹ جیسے حساس اور ہمہ گیر موضوعات اپنے پوری شدت اور پوری تاثیر کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہوئی۔ چنانچہ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کی یہ رائے کہ ''شکیب کی غزل فکری عمق سے محروم ہے''۔(۲۲) بے حد محلِ نظر ہے۔ مندرجہ بالا صفحات میں جو مبسوط تجزیہ شکیب کی غزل کا پیش کیا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی غزل اپنے پورے

فنی حسن و جمال کے ساتھ زندگی کے متنوع فکری اعماق پیش کرتی ہے۔اس کی غزل میں فکری بصیرت،تفکر کی سنجیدگی،سوچ کی گہرائی اور انفرادی سماجی شعور کی روشنائی اپنے بھرپور جمالیاتی رچاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

اس کی غزل میں فرد فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ڈاکٹر انور سدید نے درست لکھا ہے کہ ''شکیب جلالی کا داخلی تحرک گرد و پوش کی اشیا اور مظاہر کو نئی ترتیب دیتا ہے اور ان کے اظہار کے لیے استعارے اور علامتیں فراہم کرتا ہے۔شکیب کی غزل انسان اور فطرت کے درمیان رابطہ قائم کرتی ہے۔انہوں نے نئی غزل کی مزاج سازی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔''(۲۳)

شکیب نے اپنے علائم و رموز گرد و پیش سے اخذ کیے ہیں۔اس کے ڈکشن میں قریبی اشیا کے وجود کا احساس ملتا ہے۔اس کے ہاں غزل کو فطرت اور زمین کا لمس نصیب ہوا ہے۔اس کے ہاں اپنے گرد و پیش کی بو باس رچی ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ نئی علامات ہونے کے باوجود ان میں اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔یہ ہماری زندگی کا حصہ ہیں اور اسی لیے اس کے لہجے میں بے پناہ گھلاوٹ،نرمی اور تخلیقی رچاؤ ہے۔اس کے خارجی اور داخلی مشاہدات و مظاہر مل کر ایک ہو گئے ہیں۔لفظ اور خیال اس کے ہاں لازم و ملزوم ہیں۔پتھر،پانی،صحرا،چاندنی،کنول،پیڑ،روشنی،چٹان،لہو،آتشدان،جنگل،صحرا،گھر،آندھی،سورج، دھوپ،شام،سناٹا،کرب،رات،اجالا،دریچہ،دستک،گلال،دھواں،آواز،جزیرہ،ابر،پرچھائیں،کھڑکیاں،منڈیریں، حویلی،بدن،لب،اشک،ندامت،دالان،کمرے،نیلی چادر،روشندان،خاموشی،غبار،کواڑ،پتوار،چھتنار،خزاں،چراغ، پانی،سکوت،تتلیاں،گلدان،اذان،سائبان،زنداں،کلی،نوحہ،ٹہنی،وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو شکیب نے اپنی غزل میں علامتوں،تلازموں اور شعری اصطلاحات کا درجہ دیا ہے۔اس میں دھوئیں،غبار،راکھ اور آدم گزیدہ لوگوں کا ذکر ہے۔جدید انسان اپنی زندگی کا سفر صحرائے بسیط میں کر رہا ہے اور اس کے سر پر دھوپ کا سائبان ہے۔اس لیے دھوپ،سایہ،صحرا،اس کی غزل کے عنوان ہیں۔اس کی غزل میں ایرانی عجمی ماحول نہیں بلکہ مقامی بستیوں،شہروں،جنگلوں کا ماحول ہے۔گھروں، منڈیروں اور صحنوں کا ذکر ہے۔اس کے ہاں کمروں کے خالی ہونے اور سایوں سے آنگن بھرنے کا ذکر ہے۔نیلی چادر سے اپنی عریانی کو ڈھانپنے کا ذکر ہے۔فصیل جسم پر تازہ لہو کے چھینٹے سجا کر حدود وقت سے آگے نکلنے کا ذکر ہے۔رات کو روشندان پر بوندوں کے بجنے اور خموشی کے انگلیاں چٹخانے کا ذکر ہے۔ستاروں کا سسکیاں بھرنا،اوس کا رونا،فضاؤں میں کھلے پانی کی دہشت،اجالے کے خطوط،وقت کی ڈور،اندھیرے کی چٹان،رات کی دلدل،تجلی کی شعاعیں،بستیوں کی فضا،ہوا کا درختوں میں رونا،خاموشیوں کا صحرا،صدا کا غبار،کلی کی تربت،ہوا کا نوحہ،آڑھی ترچھی لکیریں،اجاڑ بستی،انگیٹھی،پانی کے درخت،لہو لہو سلاخیں،ملول چہرے،کانچ کے گلدان پر تتلیاں منڈلانا،اداس بیابانِ یاس،گلیوں میں چاندنی کا جھانکنا،الاپ،الٹی کشی.....غرض اس کی غزل کی فضا،اس کی لفظیات و تراکیب اس کی غزل کی علامتی کائنات،اس کی پیکر آفرینی کلاسیکی ہونے کے باوجود ہماری جدید ترین حسیت اور ہمارے گرد و پیش سے ہم آہنگ ہے۔اسی لیے بہت سے جدیدیت پسند شاعروں کی طرح اس کی شاعری ابہام کی دھند میں ملفوف نہیں بلکہ اس کے ہاں علامت ابلاغ کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

مندرجہ بالا جائزے سے ثابت ہوتا ہے کہ شکیب جلالی اپنی داخلی واردات،تجربات،رویے اور طرزِ احساس

غرضیکہ اظہار کے سانچوں، فکر و ذہن، اسالیب و علامت اور پیکر تراشی کے اعتبار سے نئی غزل کا رجحان ساز شاعر ہے۔ اس کی شاعری کسی بندھے ٹکے جامد نظریے، ماحول اور معروض کی پابند نہیں۔ اس کے باوجود ہمارے عہد کی زندگی، مخصوص سیاسی، سماجی اور انفرادی ٹوٹ پھوٹ کے تناظر کی پیداوار ہے۔

اس کے ہاں بہت سے دوسرے جدیدیت پسندوں کی طرح محض داخلیت، ابہام، شکستگی، مایوسی، تنہائی اور موت کے دھندلکے نہیں ہیں بلکہ صنعتی عہد کا فرد، مشینی عہد کی زندگی اپنی مکمل دھوپ چھاؤں کے ساتھ موجود ہے۔ اس نے محض ۳۲ سال کی عمر پائی۔ مگر اس کے کلام کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ذہنی و فنی بلوغت اور پختگی و صلابت سن و سال کی پابند نہیں ہوتی چنانچہ ایسے بے شمار شاعر ہیں جو بزرگی کے باوجود فکر و فنی اعتبار سے ابھی تک بچپن میں جی رہے ہیں۔ محض ۲۵، ۳۰ برس کی عمر میں شکیب کے ہاں ایسی فنی پختگی، فکری بالیدگی اور تفکر کی سنجیدگی ہے جو ہمارے ہاں عام تصورات کے مطابق عموماً ادھیڑ عمری میں یا فکری و فنی عروج کے دور میں نصیب ہوتی ہے۔ وہ اردو غزل کے بالکل نئے عہد کا پہلا باقاعدہ جدیدیت پسند شاعر ہے۔ وہ پاکستان بننے کے بعد اردو غزل کی روایت میں صحت مند جدیدیت کا علمبردار اور معمار ہے۔ وہ صحیح معنوں میں متوازن جدیدیت کا تمثال آفریں غزل گو ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''شکیب جلالی''، مشمولہ: فنون (غزل نمبر)، مئی جون، ۱۹۶۵ء، ص ۴۶۰

۲۔ احمد ندیم قاسمی، ''احمد ندیم قاسمی کے مختلف مضامین سے اقتباسات''، مشمولہ، کلیاتِ شکیب جلالی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۵

۳۔ احمد ندیم قاسمی، ''.....احمد ندیم قاسمی کے مختلف مضامین سے اقتباسات''، مشمولہ، کلیاتِ شکیب جلالی، مرتبہ، اقدس رضوی، ص ۳۵

۴۔ احمد ندیم قاسمی، ''شکیب جلالی''، مشمولہ: فنون (غزل نمبر)، مئی جون، ۱۹۶۵ء، ص ۴۶۰

۵۔ احمد ہمدانی، ''شکیب کا فن''، مشمولہ: کلیاتِ شکیب جلالی، مرتبہ، اقدس رضوی، ص ۹۷

۶۔ وارث کرمانی، پروفیسر، ''شکیب جلالی جواں فکر اور جواں مرگ شاعر''، مشمولہ: کلیاتِ شکیب جلالی، مرتبہ، اقدس رضوی، ص ۹۲

۷۔ بحوالہ خط اسلم انصاری بنام سعیدہ پروین، تحریر کردہ ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء مشمولہ، ''شکیب جلالی شخصیت اور فن''، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے اُردو) از سعیدہ پروین، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۱۹۸۰ء، ص ۱۹۴

۸۔ قمر تسکین، ''شکیب جلالی: ملکِ سخن کا شہزادہ''، روزنامہ امروز، لاہور، ۲۹ مئی ۱۹۷۷ء

۹۔ بحوالہ خط انور سدید، ڈاکٹر، بنام سعیدہ پروین تحریر کردہ ۱۸ مئی ۱۹۸۰ء: مشمولہ، ''شکیب جلالی شخصیت اور فن''، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے) اُردو از سعیدہ پروین، ص ۱۹۴

i- شکیب جلالی کی بیگم سیدہ محمدشہ خاتون ان کی پیدائش ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء بتاتی ہیں۔ (دیکھئے: فلیپ ''کلیاتِ شکیب جلالی''، مرتبہ، اقدس رضوی)؛

ii- احمد ندیم قاسمی نے یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء لکھی ہے۔ (دیکھئے: احمد ندیم قاسمی کا فلیپ 'روشنی اے روشنی' از شکیب جلالی، مکتبہ فنون، ۱۹۷۲ء)؛

iii- سعیدہ پروین نے یکم اکتوبر ۱۹۳۴ء کو معتبر قرار دیا ہے دیکھئے: ''شکیب جلالی: شخصیت اور فن''، (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے اُردو) از سعیدہ پروین، ص ۵، ۶

۱۰۔ ماخذات:

i- فلیپ کلیاتِ شکیب جلالی، مرتبہ اقدس رضوی؛

ii- احمد ندیم قاسمی احمد ندیم قاسمی کا فلیپ 'روشنی اے روشنی' از شکیب جلالی؛

iii- سعیدہ پروین ''شکیب جلالی: شخصیت اور فن''، غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اُردو (باب اول)؛

iv- امتیاز کلثوم، ''شکیب جلالی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ''، (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، دیباچہ ''روشنی اے روشنی''

۱۲۔ اقدس رضوی، ''پیش لفظ''، مشمولہ، کلیاتِ شکیب جلالی، ص ۲۳

۱۳۔ پیش لفظ از سارتر، مشمولہ، ''افتادگانِ خاک''، از فینن، ترجمہ، محمد پرویز/سجاد باقر رضوی، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۷ تا ۲۰

۱۴۔ جدیدیت کے مباحث اور ان کی تفصیل جاننے کے لیے مختلف ماخذات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں مثلاً:

i- رشید امجد، ڈاکٹر، مضمون ''جدیدیت ایک جائزہ''، مشمولہ، پاکستانی ادب: رویے اور رجحانات، پورب اکادمی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۷۹ تا ۹۱؛

ii- رشید امجد، ڈاکٹر، مضمون ''شاعری کی سیاسی و فکری روایت'' اور ''نظم سے جدید نظم تک''، مشمولہ، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، دستاویز مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۳ء، ۹ تا ۳۸/ ۴۷ تا ۶۶؛

iii- رشید امجد، ڈاکٹر، مضمون، ''پاکستانی ادب کے نمایاں رجحانات''، مشمولہ؛ پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال، (کتابی سلسلہ، عبارت-۱) مرتبہ، نوازش علی، ڈاکٹر، راولپنڈی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۸ تا ۲۶؛

iv- وقار احمد رضوی، ''تاریخ جدید اردو غزل''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۸۷۶ تا ۸۹۰

اسی طرح مندرجہ ذیل کتب بھی جدیدیت کے لیے ملاحظہ کی جا سکتی ہیں:۔

(i) جدیدیت کی فلسفیانہ اساس از ڈاکٹر شمیم حنفی (ii) نئی شعری روایت از ڈاکٹر شمیم حنفی (iii) اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت از ڈاکٹر عنوان چشتی (iv) جدید اردو ادب از ڈاکٹر محمد حسن (v) قصہ نئی شاعری کا از احمد ہمدانی (vi) نئی شاعری

مرتبہ افتخار جالب (vii) نظم جدید کی کروٹیں از ڈاکٹر وزیر آغا (viii) نئی نظم کا سفر از ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی (ix) جدیدیت اور اردو ادب از آلِ احمد سرور (x) جدید تنقید اور مابعد جدید تنقید از ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ وغیرہ

۱۵۔ وارث کرمانی، پروفیسر، ''شکیب جلالی: جواں فکر اور جواں مرگ شاعر''، مشمولہ؛ کلیاتِ شکیب جلالی، مرتبہ، اقدس رضوی، ص۹۵، ۹۶

۱۶۔ شکیب جلالی، نظم، ''سفیر''، مشمولہ، کلیاتِ شکیب جلالی، ص۴۴۹

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، ''.....احمد ندیم قاسمی کے مختلف مضامین سے اقتباسات''، مشمولہ، کلیاتِ شکیب جلالی، ص۲۰

۱۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی، مضمون ''شکیب جلالی: مشعلِ درد اب بھی روشن ہے''، مشمولہ؛ کلیاتِ شکیب جلالی، ص۵۹

۱۹۔ ابوالکلام قاسمی، مضمون، ''شکیب جلالی کی غزل کے امتیازات''، مشمولہ، کلیاتِ شکیب جلالی، ص۸۴

۲۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر، ''پاکستانی ادب''، ص۵۳

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، ''.....احمد ندیم قاسمی کے مختلف مضامین سے اقتباسات''، مشمولہ؛ کلیاتِ شکیب جلالی، ص۳۱

۲۲۔ ناشاد، ارشد محمود، ڈاکٹر، ''اردو غزل کا تکنیکی ہیئتی اور عروضی سفر''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۲۵۸

۲۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر تاریخ''، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۴۹۹